ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3919

Program: BS Islamic Studies (Spec. Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست کا نظم ونسق (3919) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: مسلم ریاست کی خصوصیات — شوریٰ اور امر بالمعروف — اور جدید جمہوری نظام سے ہم آہنگی (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ مسلم ریاست کی خصوصیات (شوریٰ، اور امر بالمعروف) کو جدید جمہوری نظام سے کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ (20)

تمہید و تعارف

اسلامی ریاست کا تصور محض اقتدار اور نظم و ضبط کا نام نہیں بلکہ یہ اقدار پر مبنی ایک فلاحی اور اخلاقی نظام ہے جس میں حکومت کو عوام کی خدمت، عدل کی فراہمی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست نے یہ ثابت کر دیا کہ ریاست کی بنیاد نسل، زبان یا علاقے کے بجائے عقیدہ، اخلاق اور باہمی معاہدے پر رکھی جا سکتی ہے۔ اس ریاست کی نمایاں خصوصیات میں شوریٰ یعنی مشاورت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی نیکی کی تلقین اور برائی کی روک تھام کا اجتماعی نظام، قانون کی بالادستی، مساوات، احتساب اور عوامی فلاح سرفہرست ہیں۔ دورِ حاضر کے جدید جمہوری نظام میں بھی عوام کی شرکت، منتخب نمائندگی، مشاورت، آزادیِ رائے، احتساب اور قانون کی حکمرانی کو بنیادی اصول مانا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ سوال اہم ہے کہ مسلم ریاست کی ان دو خصوصیات، یعنی شوریٰ اور امر بالمعروف، کو جدید جمہوری اداروں سے کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے تاکہ ایک طرف دینی اقدار محفوظ رہیں اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے انتظامی تقاضے بھی پورے ہوں۔ اس جواب میں پہلے مسلم ریاست کی عمومی خصوصیات بیان کی جائیں گی، پھر شوریٰ اور امر بالمعروف کی وضاحت ہو گی، اس کے بعد جمہوریت سے مشترکات اور اختلافات کا جائزہ لے کر ہم آہنگی کی عملی صورتیں پیش کی جائیں گی۔ یاد رہے کہ یہ بحث خالصتاً علمی اور آئینی نوعیت کی ہے؛ کسی خاص مقدمے یا شخص پر شرعی حکم کا اطلاق مستند علماء اور عدالتوں کا کام ہے۔

مسلم ریاست کی عمومی خصوصیات

مسلم ریاست کی پہلی خصوصیت حاکمیت کا دینی تصور ہے، یعنی اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان زمین پر اس کا نائب اور امین ہے۔ قرآن کریم میں اہلِ ایمان کو اسی مفہوم کی طرف رہنمائی ملتی ہے کہ زمین میں اقتدار ملنے پر وہ نماز و زکاۃ جیسے ارکان کا اہتمام کریں اور معروف کی تلقین اور منکر کی روک تھام کا فریضہ انجام دیں (سورۃ الحج 22:41 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس تصور کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکمران خود کو قانون سے بالا نہیں سمجھتا بلکہ شریعت اور آئین کا پابند رہتا ہے۔ دوسری خصوصیت قانون کی بالادستی ہے: مدنی ریاست میں امیر و غریب، رشتہ دار و اجنبی سب کے لیے ایک ہی قانون تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ قانون کی زد سے کوئی بڑا آدمی مستثنیٰ نہیں

ہونا چاہیے، کیونکہ پچھلی اقوام کی تباہی کا ایک سبب یہی دوہرا معیار تھا (متفق علیہ روایت کے مفہوم کا خلاصہ)۔ تیسری خصوصیت عدل و مساوات ہے، چوتھی ذمہ دارانہ امانت کا شعور ہے جس کے مطابق ہر عہدہ امانت ہے، پانچویں عوامی فلاح و کفالت ہے، چھٹی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہے جس کی روشن مثال میثاقِ مدینہ ہے، اور ساتویں خصوصیت احتساب ہے یعنی حکمران سے لے کر عام اہل کار تک ہر شخص جواب دہ ہے۔ یہ خصوصیات مل کر ایسا نظام بناتی ہیں جس میں طاقت خدمت میں بدل جاتی ہے۔

شوریٰ: مفہوم، دینی بنیاد اور مدنی عمل

شوریٰ کے لغوی معنی مشورہ کرنے اور کسی معاملے کو اہلِ رائے کے سامنے رکھ کر غور و فکر کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں شوریٰ وہ نظام ہے جس میں ریاستی اور اجتماعی فیصلے انفرادی رائے کے بجائے اہلِ علم، اہلِ تجربہ اور عوامی نمائندوں کے مشورے سے کیے جائیں۔ قرآن کریم نے مشورے کو اہلِ ایمان کی صفت قرار دیا ہے (سورۃ الشوریٰ 42:38 کے مفہوم کا خلاصہ) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صحابہ سے مشورہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے (سورۃ آلِ عمران 3:159 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے مؤید تھے، اس کے باوجود آپ نے عملی طور پر مشاورت کو معمول بنایا تاکہ امت کے لیے اسوہ قائم ہو۔ غزوۂ بدر میں حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر پڑاؤ کی جگہ بدلی گئی، غزوۂ احد میں اکثریت کے مشورے پر مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ ہوا، غزوۂ خندق میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر خندق کھودی گئی اور صلح حدیبیہ سمیت بہت سے معاملات میں آپ نے صحابہ سے رائے لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ محض رسمی عمل نہیں بلکہ فیصلہ سازی کا اصل اصول ہے، جس میں تجربہ، زمینی حقائق اور اجتماعی دانش کو انفرادی رائے پر ترجیح ملتی ہے اور فیصلے کی ذمہ داری بھی اجتماعی ہو جاتی ہے، جس سے عمل درآمد آسان ہو جاتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر: مفہوم اور دائرہ

امر بالمعروف سے مراد نیکی، بھلائی اور ہر اس کام کی تلقین و ترغیب ہے جسے شریعت اور صحت مند انسانی فطرت اچھا قرار دے، اور نہی عن المنکر سے مراد ہر اس برائی، ظلم، بدعنوانی اور اخلاقی بگاڑ سے روکنا ہے جو فرد اور معاشرے کو نقصان پہنچائے۔ قرآن کریم نے اس امت کی ایک نمایاں صفت یہی فریضہ بیان کیا ہے (سورۃ آلِ عمران 3:110

کے مفہوم کا خلاصہ) اور حکمرانوں سمیت پورے معاشرے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ مدنی ریاست میں یہ فریضہ صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی ادارہ جاتی صورت بھی سامنے آئی: بازاروں کی نگرانی، ناپ تول کی درستی، مظلوم کی دادرسی اور اخلاقی ماحول کی حفاظت اسی نظام کے عملی پہلو تھے۔ بعد کے ادوار میں محتسب کا ادارہ اسی اصول کی توسیع تھی۔ اس نظام کی حکمت یہ [illegible] جبر کے بجائے سماجی شعور پیدا کیا جائے، تاکہ لوگ قانون کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے ایمانی و اخلاقی احساس سے نیکی کی طرف مائل ہوں اور برائی سے نفرت کریں۔ البتہ اس فریضے کی حدود بھی شریعت نے متعین کی ہیں: کسی کے گھر کی ٹوہ، بے جا تجسس اور قانون کو ہاتھ میں لینا اس میں شامل نہیں، اور کسی خاص فرد پر حکم کا اطلاق مجاز حکام، علماء اور عدالتوں کے دائرے میں آتا ہے۔

جدید جمہوریت سے مشترکہ نکات

شوریٰ اور جمہوریت کے درمیان کئی بنیادی مشترکات پائے جاتے ہیں۔ پہلا اشتراک فیصلہ سازی میں شرکت ہے۔ شوریٰ میں اہلِ رائے اور نمائندے شامل ہوتے ہیں اور جمہوریت میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے شریک ہوتے ہیں۔ دوسرا اشتراک احتساب ہے: اسلامی تاریخ میں خلیفہ راشد سے گریبان پکڑ کر سوال کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اور جمہوریت میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور میڈیا کے ذریعے حکومت سے بازپرس ہوتی ہے۔ تیسرا اشتراک قانون کی حکمرانی اور مساوات ہے جو دونوں نظاموں کی روح ہے۔ چوتھا اشتراک آزادیِ اظہار ہے: شوریٰ کا تقاضا ہے کہ مشورہ دینے والا بلا خوف و خطر اور بلا مصلحت اندیشی سچی رائے دے، یہی تقاضا جدید جمہوری کلچر کا بھی ہے۔ پانچواں اشتراک عوامی مفاد کی بالادستی ہے: دونوں نظام ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ امر بالمعروف کے لحاظ سے بھی اشتراک واضح ہے، کیونکہ جدید ریاستوں میں تعلیم کی ترویج، منشیات و جرائم کی روک تھام، ماحولیاتی تحفظ، بدعنوانی کے خلاف ادارے، محتسب اعلیٰ یعنی اومبڈزمین اور سول سوسائٹی کی سماجی اصلاح کی کوششیں عملاً اسی اصول کی جدید صورتیں ہیں کہ معاشرہ اپنے اندر نیکی کو فروغ دے اور برائی کی حوصلہ شکنی کرے۔

جدول: شوریٰ و امر بالمعروف اور جدید جمہوری اداروں کا موازنہ

ہم آہنگی کی عملی شکل	جدید جمہوری صورت	مدنی ریاست میں صورت	اصول

منتخب ایوان کو مشاورتی و قانون ساز ادارہ بنانا	پارلیمنٹ، کمیٹیاں، کابینہ	صحابہ واہلِ رائے سے مشاورت	شوریٰ
آزاد عدلیہ واحتسابی ادارے شریعی حدود میں	عدلیہ، آڈٹ، میڈیا	حکمران کی عوامی جواب دہی	احتساب
اصلاحی ادارے قانون واخلاق کی پابندی کے ساتھ	سماجی اصلاح، اومبڈزمین، سول سوسائٹی	تلقین، بازار واخلاق کی نگرانی	امر بالمعروف
آئین میں مساوی حقوق کی ضمانت	بنیادی حقوق ومساوی شہریت	قانون کے سامنے سب برابر	مساوات

اختلافات اور ہم آہنگی کی صورتیں

یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ دونوں نظاموں میں کچھ اصولوں پر اختلاف بھی ہے۔ جمہوریت کی مغربی صورت میں مقتدرِ اعلیٰ عوام کو مانا جاتا ہے اور قانون سازی کسی دینی حدود کی پابند نہیں سمجھی جاتی، جبکہ اسلامی نظام میں قانون سازی کتاب وسنت کے طے شدہ اصولوں اور قطعی احکام کی حدود کے اندر رہتی ہے۔ اسی طرح آزادی کا تصور بھی دونوں میں مختلف ہے: اسلام آزادی کو اخلاقی حدود کے ساتھ جوڑتا ہے۔ تاہم ہم آہنگی اس وجہ سے ممکن ہے کہ جمہوریت کے بیشتر انتظامی وطریقہ کار والے پہلو یعنی انتخابات، نمائندگی، مشاورت، احتساب، آزاد عدلیہ، مقامی حکومتیں اور عوامی رائے کا احترام وہ ذرائع ہیں جن پر دینی اعتبار سے کوئی اصولی اعتراض نہیں، بشرطیکہ مقاصد اور حدود شریعت کے مطابق رہیں۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں عہد کے مفید تجربات کو اپنے اصولوں کی روشنی میں اپنایا؛ انتظامی تقسیمات، دیوانوں اور مالی نظام کی تنظیم اس کی مثالیں ہیں۔ لہٰذا ہم آہنگی کا درست طریقہ یہ ہے کہ اصول اسلام سے لیے جائیں اور طریقہ کار زمانے کے تجربے سے، اور ہر نئے ادارے کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے کہ وہ عدل، فلاح اور اخلاقی مقاصد کو آگے بڑھاتا ہے یا نہیں۔ کسی شے کی حلت وحرمت کے قطعی فیصلے البتہ مستند علماء کے دائرۂ کار میں ہیں۔

عملی تجاویز: ادارہ جاتی ہم آہنگی

عملی سطح پر ہم آہنگی کی چند صورتیں یہ ہو سکتی ہیں۔ اول، پارلیمنٹ کو شوریٰ کا جدید ادارہ قرار دے کر اس میں اہلِ علم و اہلِ تجربہ کی مؤثر نمائندگی یقینی بنائی جائے اور قانون سازی سے قبل متعلقہ شعبوں کے ماہرین اور علماء کی رائے باقاعدہ لی جائے۔ دوم، وزارتوں اور مقامی حکومتوں میں مشاورتی کونسلیں قائم کی جائیں تاکہ فیصلے زمینی حقائق سے قریب ہوں۔ سوم، امر بالمعروف کے لیے جبر کے بجائے تعلیم، میڈیا اور سول سوسائٹی کو ذریعہ بنایا جائے؛ اسکول کی نصابی و اخلاقی تربیت، خطبہ و مسجد کے اصلاحی کردار اور فلاحی تنظیموں کی سرگرمیاں اس کی مؤثر صورتیں ہیں۔ چہارم، بدعنوانی، ناپ تول میں کمی اور عوامی حقوق کی خلاف ورزی جیسے سماجی منکرات کے خلاف انتظامی ادارے قانون کے اندر رہ کر کارروائی کریں، جسے کلاسیکی فقہ میں حسبہ کا نظام کہا گیا ہے۔ پنجم، ہر ادارے کے سامنے احتساب کا شفاف نظام ہو: آڈٹ، سوالات و جوابات کے اجلاس اور عوام کو معلومات تک رسائی کا حق۔ ان تجاویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم آہنگی نعرے بازی سے نہیں بلکہ اداروں کی درست ساخت، شفاف طریقہ کار اور اخلاقی تربیت سے پیدا ہوتی ہے اور یہی مدنی ریاست کا اصل سبق ہے۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ شوریٰ اور امر بالمعروف مسلم ریاست کی وہ دو خصوصیات ہیں جو اسے محض طاقت کا نظام بننے سے بچا کر خدمت، عدل اور اخلاق کا نظام بناتی ہیں۔ شوریٰ فیصلوں کو اجتماعی دانش عطا کرتی ہے اور امر بالمعروف معاشرے کو اندر سے درست رکھتا ہے۔ جدید جمہوریت کے انتظامی طریقے، یعنی نمائندگی، مشاورت، احتساب، قانون کی حکمرانی اور شہری تنظیموں کی اصلاحی کوششیں، ان اصولوں سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ اختلاف جہاں ہے وہ مقاصد و حدود کا ہے، اور وہیں اسلامی نظام اپنی منفرد شناخت قائم رکھتا ہے۔ درست راہ یہی ہے کہ اصول و اقدار اسلام سے اور مؤثر طریقہ کار عہد کے تجربے سے لے کر ایسی ریاست تشکیل دی جائے جو مدنی ریاست کے فلاحی و اخلاقی اہداف کو آج کے حالات میں حاصل کر سکے۔

سوال نمبر 2: عربوں کی مہمان نوازی اور شجاعت کی تاریخی مثالیں (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ عربوں کی مہمان نوازی اور شجاعت کی تاریخی مثالیں پیش کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

جزیرہ نما عرب کی سخت جغرافیائی فضا، صحرا کی وسعت، پانی و چراگاہوں کی کمیابی اور قبائلی طرزِ زندگی نے عربوں کے مزاج اور اخلاقی اقدار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس معاشرے میں کچھ خوبیاں غیر معمولی درجے تک پروان چڑھیں جن میں مہمان نوازی اور شجاعت سب سے نمایاں ہیں۔ مہمان نوازی اس لیے زندگی و موت کا مسئلہ تھی کہ صحرا میں مسافر کی جان خیمے کی ضیافت ہی سے بچتی تھی، اور شجاعت اس لیے ناگزیر تھی کہ قبیلے کی عزت، مال، زن اور آب گاہوں کا تحفظ تلوار اور حوصلے ہی سے ممکن تھا۔ عرب ادب، ایامِ عرب کی داستانیں، امثال اور شاعری ان دونوں خوبیوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ان مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد محض تماشا آموزی نہیں بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ اسلام نے جب اس معاشرے کی اصلاح و تربیت کی تو کن موجودہ اخلاقی سرمایوں کو سنوار کر اعلیٰ مقاصد سے جوڑا۔ اس جواب میں پہلے ان اقدار کے پس منظر پر روشنی ڈالی جائے گی، پھر مہمان نوازی اور شجاعت کی معروف تاریخی مثالیں پیش کی جائیں گی اور آخر میں اسلام کی تربیت نے ان خوبیوں کو جو نئی سمت دی اس کا ذکر ہو گا۔ واقعات کی تفصیل میں صرف وہی باتیں رکھی گئی ہیں جو تاریخی و ادبی ماخذ میں عام طور پر معروف ہیں۔

عرب اخلاقیات کا پس منظر: مروت کا تصور

عربوں کے ہاں مثالی انسان کی خوبیوں کو مجموعی طور پر مروت کہا جاتا تھا۔ مروت میں سخاوت، مہمان نوازی، شجاعت، صبر، وعدے کی پابندی، پڑوسی کی حفاظت اور عزتِ نفس کی پاسداری شامل تھی۔ صحرائی معاشرے میں شہرت ہی اصل سرمایہ تھی: جو قبیلہ یا سردار سخی و بہادر مشہور ہو جاتا، اس کے پاس مسافر، پناہ گزین اور حلیف جمع ہو جاتے اور اس کی طاقت بڑھ جاتی، جبکہ بخل اور بزدلی کی بدنامی پورے قبیلے کو ذلیل کر دیتی تھی۔ اسی لیے سردار اپنے مال کو ذات کے بجائے قبیلے کی عزت کے لیے خرچ کرتا اور جنگ میں آگے بڑھ کر لڑتا۔ شاعری اس شہرت کی تشہیر کا بڑا ذریعہ تھی؛ اچھے شعرا کی زبان پر آنے والی مدح پورے عرب میں پھیل جاتی تھی۔ اس پس منظر کو سمجھے بغیر مہمان نوازی

اور شجاعت کی انتہائی مثالوں کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ وہ محض شخصی عادت نہیں تھی بلکہ پورے معاشرے کے نظامِ اقدار کا اظہار تھی۔ البتہ یہی نظام جب عصبیت سے جڑا تو ظلم کی حمایت اور ناحق جنگ جیسی خرابیاں بھی پیدا ہوئیں، جن کی اصلاح اسلام نے کی۔ پھر بھی تاریخ کی امانت یہ تقاضا کرتی ہے کہ خوبی کو خوبی کے طور پر تسلیم اور بیان کیا جائے۔

مہمان نوازی کی مثالیں: حاتم طائی

مہمان نوازی کی سب سے مشہور مثال حاتم طائی ہیں، جن کی سخاوت ضرب المثل بن گئی اور آج تک اردو و فارسی میں حاتم طائی سخاوت کا استعارہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حاتم کے ہاں مہمان کے لیے آگ جلائی رکھی جاتی تھی تاکہ رات کو صحرا میں بھٹکتا مسافر روشنی دیکھ کر آ جائے۔ یہ عرب ضیافت کا عمومی رواج بھی تھا۔ ایک مشہور روایت کے مطابق قحط کے زمانے میں جب قبیلے کے بچے بھوک سے رو رہے تھے تو حاتم نے اپنی وہ گھوڑی ذبح کرا دی جو ان کی سب سے قیمتی سواری تھی، تاکہ بھوکوں کو کھانا مل جائے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں آنے والا سوالی خالی نہ لوٹتا تھا اور انھوں نے اپنی زندگی میں ضیافت و عطا پر اتنا خرچ کیا کہ خود تنگ دستی میں رہے۔ ان کی والدہ غنیہ بنت عفیف بھی اسی سخاوت میں معروف تھیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض ایک فرد کی عادت نہیں بلکہ ایک تربیت یافتہ گھریلو و قبائلی فضا تھی۔ حاتم اسلام سے قبل کے عرب تھے؛ ان کی مثال بتاتی ہے کہ وحی کی روشنی کے بغیر بھی صحرائی معاشرے نے مہمان کو اللہ کی رحمت اور اس کی خدمت کو انسانیت کی معراج قرار دے رکھا تھا۔

مہمان نوازی کی مزید مثالیں

حاتم کے علاوہ بھی عرب تاریخ میں ضیافت کی کئی معروف مثالیں ملتی ہیں۔ معن بن زائدہ شیبانی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی دسترخوان پر مسافروں و محتاجوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہ قیدیوں کو چھڑانے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے کے لیے بھی مشہور تھے؛ ان کے بارے میں یہ قصہ بھی معروف ہے کہ انھوں نے اپنے قاتل کے ارادے سے آنے والے شخص کو بھی اکرام سے نوازا تو وہ شرمندہ ہو کر لوٹ گیا۔ صحابہ کرام کے دور میں یہی جذبہ دینی رنگ اختیار کر گیا۔ حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر مہمان آیا تو گھر میں بچوں کے سوا کسی کے کھانے کو کچھ نہ تھا؛ میاں بیوی نے بچوں کو بہلا کر سلا دیا، چراغ بجھا دیا اور مہمان کو خود کھانے کا دھوکا دے کر پورا کھانا اسے کھلا

دیا، حالانکہ دونوں بھوکے رہے۔ اس ایثار کو قرآن کریم نے انصار کی صفت کے طور پر سراہا ہے (سورۃ الحشر 59:9 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مہمان نوازی کا اعلیٰ نمونہ تھی: وفود آپ کے ہاں آتے تو آپ ان کی خاطر مدارات فرماتے، اصحابِ صفہ آپ کے مہمان ہوتے اور گھر میں جو کچھ ہوتا اس میں دوسروں کو شریک کیا جاتا تھا۔ ان مثالوں سے یہ نکتہ روشن ہوتا ہے کہ عرب ضیافت جب ایمان و اخلاص سے جڑی تو وہ محض رسم کے بجائے عبادت و ایثار بن گئی۔

شجاعت کی مثالیں: عنترہ بن شداد

شجاعت کی مثالوں میں عنترہ بن شداد عبسی کا نام سرفہرست ہے، جو جاہلی عرب کے عظیم ترین شہ سواروں و شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کا معلقہ عربی ادب کا شاہکار ہے۔ عنترہ غلام زادے تھے اور قبیلے میں انھیں وہ مقام حاصل نہ تھا جو آزاد سرداروں کو ملتا تھا، لیکن جب قبیلہ پر حملہ ہوتا تو وہی عنترہ سب سے آگے ہوتے۔ مشہور روایت ہے کہ ایک حملے کے وقت ان کے والد شداد نے کہا کہ حملہ کرو، تو عنترہ نے اپنے معاشرتی مقام کا شکوہ کیا؛ اس پر انھیں آزادی اور شناخت دی گئی اور تب انھوں نے وہ کارنامے دکھائے جو ضرب المثل بن گئے۔ ان کی شجاعت کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جنگ کو تماشا نہیں سمجھتے تھے اور اپنے اشعار میں دشمن کی عزت و مروت کا بھی اعتراف کرتے تھے؛ ان کی بہادری تلوار کے ساتھ اخلاق سے بھی آراستہ تھی، کیونکہ وہ غنیمت کے بجائے قبیلے کی عزت و ناموس کے دفاع کو اصل مقصد سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی اس بات کی تاریخی گواہی ہے کہ صحرائی معاشرے میں شجاعت نے ایک محروم طبقے کے فرد کو صلاحیت کی بنیاد پر عزت کا مقام دلایا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ شجاعت قبائلی عصبیت کے دائرے میں محدود تھی، جسے اسلام نے حق و عدل کے عالمی معیار سے جوڑا۔

شجاعت کی مزید مثالیں

عرب شجاعت کی دوسری بڑی مثال حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں، جو اسلام سے پہلے بھی مکہ کے بہادر نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے اور اسلام لانے کے بعد ان کی شجاعت دین کی حفاظت سے جڑ گئی۔ غزوۂ بدر میں ان کی تلوار بازی اور غزوۂ احد میں ان کا جاں نثارانہ لڑنا اور شہادت سیرت کی تاریخ کے روشن ابواب ہیں (عام سیرت ماخذ کے معروف واقعات)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شجاعت بھی تاریخی ضرب المثل ہے: ہجرت کی رات بستر نبوی پر لیٹنا، جنگِ خندق میں عمرو بن عبدود جیسے

مشہور پہلوان کا مقابلہ، اور خیبر میں مرحب سے جنگ ان کے کارناموں میں شامل ہے۔ خندق کے موقع پر عمرو کا للکارنا اور پورے ماحول کی خاموشی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آگے بڑھنا اس بات کی مثال ہے کہ شجاعت محض جسمانی قوت نہیں بلکہ وقت پر ذمہ داری قبول کرنے کا نام ہے۔ خواتین میں حضرت نسیبہ بنت کعب، ام عمارہ رضی اللہ عنہا، کی مثال بے مثل ہے، جنہوں نے احد کے میدان میں تلوار و تیر اندازی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا اور زخم کھائے۔ ان واقعات سے یہ سمجھ آتا ہے کہ اسلام نے عرب شجاعت کو مقصد، ضبط اور اخلاق عطا کیا: اب لڑائی فخر یا غنیمت کے لیے نہیں بلکہ مظلوم کے دفاع اور حق کے قیام کے لیے تھی، اور بہادر وہ قرار پایا جو غصے میں بھی انصاف نہ چھوڑے۔

جدول: مہمان نوازی و شجاعت کی چند منتخب تاریخی مثالیں

نمایاں پہلو	شخصیت / واقعہ	خوبی
قحط میں قیمتی گھوڑی ذبح کر کے بھوکوں کو کھلانا	حاتم طائی	مہمان نوازی
خود اور بیوی بھوکے رہ کر مہمان کو کھانا کھلانا	ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ	مہمان نوازی
محرومی کے باوجود قبیلے کے دفاع میں سرفہرستی	عنترہ بن شداد	شجاعت
احد میں دفاع کرتے ہوئے زخم کھانا	ام عمارہ (نسیبہ بنت کعب) رضی اللہ عنہا	شجاعت
خندق میں عمرو بن عبدود کا مقابلہ	حضرت علی رضی اللہ عنہ	شجاعت

اسلام نے ان خوبیوں کو جو سمت دی

اسلام کا نقطۂ کمال یہ نہیں کہ اس نے عربوں کی موجودہ خوبیوں کو ختم کر دیا ہو، بلکہ اس نے انھیں مقصد اور توازن عطا کیا۔ مہمان نوازی کو اسلام نے ایمان سے جوڑ دیا، یہاں تک کہ مہمان کی عزت و اکرام کو دینی اخلاق کا حصہ قرار دیا گیا (صحیح بخاری و مسلم کی معروف تعلیم کے مفہوم کا خلاصہ)۔ صدقہ و زکاۃ جیسے اداروں نے سخاوت کو انفرادی فخر

سے ہٹا کر باقاعدہ سماجی فلاح کا نظام بنا دیا، اور انفاق کو ریاکاری کے بجائے اخلاص کی آزمائش قرار دیا گیا۔ شجاعت کے میدان میں اسلام نے دو بڑی اصلاحیں کیں: ایک یہ کہ جنگ کو اخلاقی ضوابط کا پابند کیا، غیر لڑنے والوں، خواتین، بچوں اور عبادت گزاروں کو نقصان پہنچانے سے روکا گیا، اور دوسرا یہ کہ بہادری کا معیار طاقت کے بجائے صبر، استقامت اور مقصد کی حقانیت قرار پائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قبائل جو کل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، چند برس میں ایک منظم امت بن گئے جس کی سخاوت سے فقیر و مسافر فیض پاتے اور جس کی شجاعت مظلوموں کے لیے ڈھال بن گئی۔ طالب علم کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ قومی کردار کی تعمیر میں موجودہ اچھائیوں کو پہچان کر انھیں درست سمت دینا ہی کامیاب اصلاح کا راستہ ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مہمان نوازی اور شجاعت عربوں کی وہ نمائندہ خوبیاں تھیں جن پر ان کا پورا نظامِ مروت قائم تھا۔ حاتم طائی کی سخاوت، معن بن زائدہ کا اکرام، اور انصار کا ایثار ضیافت کی تاریخی مثالیں ہیں، جبکہ عنترہ بن شداد، حضرت حمزہ، حضرت علی اور ام عمارہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں شجاعت کے بے مثال نمونے ہیں۔ اسلام نے ان خوبیوں کو مٹایا نہیں بلکہ انھیں ایمان، عدل اور انسانیت کی خدمت سے جوڑ کر ان کی حیثیت کو رسم و فخر سے بڑھا کر اخلاق و عبادت کی بلندی تک پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مثالیں آج بھی کردار سازی کے لیے زندہ داستانیں ہیں۔

سوال نمبر 3: مکہ اور مدینہ کی جغرافیائی اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ مکہ اور مدینہ کی جغرافیائی اہمیت بیان کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

کسی بھی تاریخی تحریک اور ریاست کے مطالعے میں جغرافیہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ انسان کی معیشت، آمد و رفت، دفاع اور ثقافتی روابط سب کا انحصار بڑی حد تک اس کے علاقے کے محلِ وقوع اور طبعی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ جزیرہ نما عرب کے مغربی حصے، حجاز، میں واقع دو شہر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اسلامی تاریخ کے دو عظیم مراکز ہیں: مکہ دعوتِ اسلام کی جائے پیدائش اور قبلہ و حج کا مرکز ہے، جبکہ مدینہ پہلی اسلامی ریاست کا دارالحکومت، ہجرت کی منزل اور مسجدِ نبوی و روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ ان دونوں شہروں کی اہمیت مذہبی و تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ خالص جغرافیائی بھی ہے: ان کا محلِ وقوع تجارتی شاہراہوں پر ہونا، گرد و پیش کے پہاڑی سلسلے، پانی کے چشمے و کنویں، زرعی امکانات اور فاصلے و راستے وہ عوامل ہیں جنھوں نے ابتدا ہی سے ان کی سرنوشت لکھی۔ اس جواب میں پہلے حجاز کا عمومی جغرافیائی خاکہ پیش کیا جائے گا، پھر مکہ کی جغرافیائی اہمیت تجارت، دفاع اور مذہبی مرکزیت کے حوالے سے بیان ہو گی، اس کے بعد مدینہ کی زرعی، دفاعی اور مواصلاتی اہمیت واضح کی جائے گی، اور آخر میں دونوں شہروں کے تقابلی جائزے کے ذریعے یہ دکھایا جائے گا کہ اسلامی ریاست کے قیام و استحکام میں جغرافیے نے کس طرح عملی کردار ادا کیا۔

حجاز کا عمومی جغرافیائی خاکہ

حجاز جزیرہ نما عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ پھیلا ہوا خطہ ہے جو بحیرۂ احمر کے مشرقی کنارے اور اندرونی بلند علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس خطے کی نمایاں خصوصیات پہاڑی سلسلے، تنگ وادیاں، لاوے کے سیاہ میدان جنھیں حرّہ کہا جاتا ہے، کھجور کے نخلستان اور موسمی بارش پر انحصار ہیں۔ مکہ بحیرۂ احمر کی بندرگاہ جدہ سے تقریباً ستر سے اسی کلومیٹر اندرونِ ملک ایک خشک وادی میں واقع ہے، جبکہ مدینہ مکہ سے تقریباً ساڑھے تین سو سے چار سو پچاس کلومیٹر شمال میں ایک نسبتاً ہموار زرعی میدان میں آباد ہے۔ قدیم زمانے میں یمن سے شام تک چلنے والی تجارتی شاہراہ، جسے بخور و خوش بوات کی تجارت کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل تھی، انہی دونوں شہروں کے پاس سے گزرتی تھی۔ یہی شاہراہ حجاز کو ایک طرف یمن و حبشہ اور دوسری طرف شام، فلسطین، مصر اور بازنطینی دنیا سے جوڑتی تھی۔ موسمی اعتبار سے گرمی شدید اور بارش کم ہونے کی وجہ سے آبادی زیادہ تر

چشموں، کنوؤں اور نخلستانوں کے گرد مرتکز رہی۔ اس مجموعی فضا کو سامنے رکھ کر دونوں شہروں کی انفرادی اہمیت کا جائزہ لینا زیادہ آسان اور بامعنی ہو جاتا ہے، کیونکہ دونوں کی خوبیاں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتی ہیں۔

مکہ کی جغرافیائی اہمیت: وادی، پہاڑ اور دفاع

مکہ مکرمہ ایک ایسی وادی میں واقع ہے جو چاروں طرف سے گرانائٹ کے بنجر پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ قرآن کریم نے اسے ایک ایسی وادی کے طور پر بھی ذکر کیا ہے جہاں کاشت نہیں ہوتی (سورۃ ابراہیم 14:37 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ بنجر ہونے کے باوجود یہی طبعی ساخت مکہ کو قدرتی قلعہ بندی عطا کرتی تھی: پہاڑی درے محدود تھے، ان پر نگرانی آسان تھی اور بڑی فوج کا اچانک شہر میں داخل ہونا مشکل تھا۔ ابرہہ کے لشکر کی پسپائی جیسے واقعات کو سیرت نگار اس فضا میں بھی دیکھتے ہیں، البتہ اصل حفاظت اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہے۔ وادی کی تنگی نے آبادی کو محدود رقبے میں سمیٹا، جس سے بازار، مقدس حرم اور رہائشی محلے ایک دوسرے سے قریب ہو گئے اور شہری تنظیم میں آسانی رہی۔ زمزم کا کنواں اس خشک وادی میں زندگی کی رگ تھا؛ اسی کے گرد بستی پروان چڑھی اور آنے والے حاجیوں و تاجروں کی ضرورت پوری ہوتی تھیں۔ گرمی کی شدت اور زراعت کی کمی نے اہلِ مکہ کو تجارت کی طرف مائل کیا اور ان کی پوری معاشی و سماجی زندگی اسی کے گرد گھومنے لگی۔ چنانچہ مکہ کا جغرافیہ ایک طرف تحفظ اور دوسری طرف تجارتی سرگرمی دونوں کا ضامن بن گیا، جو کسی بھی تاریخی مرکز کے استحکام کے لیے بنیادی شرط ہے۔

مکہ کی تجارتی اور مذہبی مرکزیت

مکہ کی سب سے بڑی جغرافیائی نعمت اس کا تجارتی شاہراہ پر محلِ وقوع ہے۔ قریش کے قافلے سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کی طرف روانہ ہوتے تھے، جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی بطور احسان آیا ہے (سورۃ قریش 106 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ مکہ ان قافلوں کی درمیانی منزل، گودام اور منڈی تھا، جہاں یمن کی خوش بوات و کپڑا، حبشہ کا سامان اور شام کا اناج و تیل آپس میں تبادلہ پاتے تھے۔ اس تجارت نے قریش کو خوش حال، بااثر اور پورے عرب میں واقفِ کار بنایا، اور مختلف قبائل سے ان کے تجارتی و سفارتی تعلقات جڑ گئے جو بعد میں دعوت کی اشاعت میں بھی کام آئے۔ مذہبی مرکزیت اس تجارت کو دگنا فائدہ دیتی تھی: خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہونے

کی وجہ سے تمام عرب قبائل کے لیے مقدس تھا، حرم کے احترام میں اشہرِ حرم یعنی حرمت والے مہینوں میں جنگ بند رہتی تھی، اور حج و عمرے کے موسموں میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے تھے۔ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جیسے میلے مکہ کے گرد منعقد ہوتے جہاں تجارت کے ساتھ شاعری و خطابت کی محفلیں سجتی تھیں۔ چنانچہ مکہ ایک ہی وقت میں عبادت گاہ، منڈی اور ثقافتی دارالحکومت تھا، اور دعوتِ اسلام جب یہاں سے اٹھی تو اس کی آواز انہی میلوں و قافلوں کے ذریعے پورے عرب میں پہنچنا مقدر تھی۔

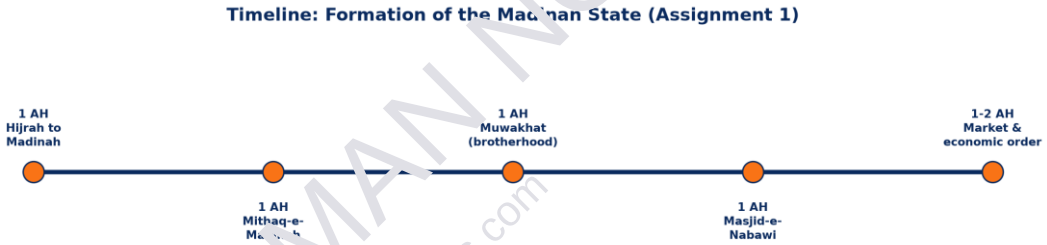
مدینہ کی جغرافیائی اہمیت: زرخیزی اور پانی

مدینہ منورہ، جس کا پرانا نام یثرب تھا، مکہ کے برعکس ایک زرخیز نخلستان تھا۔ یہاں کی زمین لاوے کے پرانے میدانوں اور سیلابی مٹی کی وجہ سے نسبتاً زرخیز تھی، زیرِ زمین پانی دسترس میں تھا اور کنوؤں و چشموں کی کثرت تھی۔ یہاں کی اصل فصل کھجور تھی جو خوراک، تجارت اور مسلسل قحط میں ذخیرے کے کام آتی تھی؛ اس کے علاوہ جو، گندم اور انگور و سبزیوں کی کاشت بھی ہوتی تھی اور وادیِ عقیق سمیت کئی وادیاں کاشت کاری کے مراکز تھیں۔ یہی زرعی خوشحالی وہ بنیادی وجہ تھی جس کی بدولت ہجرت کے بعد مہاجرین مکہ کے ٹوٹے ہوئے معاشی نظام کے باوجود مدینہ میں ایک نئی ریاست کھڑی ہو سکی: بازار موجود تھا، خوراک مقامی طور پر پیدا ہوتی تھی اور یہودی قبائل اور اوس و خزرج کے تجربہ کار کاشتکار اس معیشت کا حصہ تھے۔ مدینہ کے گرد و پیش میں وادیِ بطحان اور دیگر وادیوں کا جال آبیاری میں مدد دیتا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے مدینہ صحرا و پہاڑ کے درمیان ایک ایسی آبادی تھی جو تجارت کے بجائے زراعت پر قائم تھی، اور یہی فرق اسے مستقبل کی ریاست کے لیے مکہ سے زیادہ موزوں بنیاد فراہم کرتا ہے، کیونکہ نئی ریاست کو سب سے پہلے خوراک و سکونت کا یقینی انتظام درکار ہوتا ہے۔

مدینہ کی دفاعی اور مواصلاتی اہمیت

مدینہ کی دفاعی جغرافیائی اہمیت بھی غیر معمولی ہے۔ شہر کے مشرق و مغرب میں سیاہ لاوے کے وسیع حرّے پھیلے ہوئے ہیں جن پر پیدل چلنا بھی دشوار اور فوج کا گزرنا قریب قریب ناممکن تھا؛ جنوب کی طرف نخلستانوں و باغات کی کثرت اور شمال کی طرف نسبتاً کھلا میدان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ خندق کے وقت خندق صرف شمالی سمت میں کھودی گئی، کیونکہ باقی اطراف قدرتی رکاوٹوں سے محفوظ سمجھے گئے۔ اسی طرح احد کا پہاڑ مدینہ کے شمال میں ایک قدرتی نشانی و دفاعی پشت پناہ کے طور پر موجود تھا جس کے دامن میں

مشہور غزوہ پیش آیا۔ مواصلات کے اعتبار سے مدینہ بھی شمالی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا: یہاں سے قافلے شام کی طرف جاتے تھے اور مکہ کے قافلوں کا راستہ بھی مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا، جس کی عملی اہمیت غزوۂ بدر سمیت کئی واقعات میں ظاہر ہوئی۔ مزید یہ کہ مدینہ کا محلِ وقوع مکہ سے اتنا دور تھا کہ قریش کی روزمرہ گرفت سے باہر ریاست قائم ہو سکتی تھی، اور اتنا قریب بھی کہ حجاز کی سیاست سے روابط برقرار رہیں۔ اسی توازن نے مدینہ کو مرکزِ ریاست کے لیے مثالی مقام بنا دیا، اور بعد میں یہی شہر پورے جزیرہ نما میں اتحاد و توسیع کا محور بن گیا۔



شکل: ہجرت کے بعد مدنی ریاست کی تشکیل کے ابتدائی اقدامات کی زمانی ترتیب۔

جدول: مکہ اور مدینہ کی جغرافیائی خصوصیات کا موازنہ

پہلو	مکہ مکرمہ	مدینہ منورہ
محلِ وقوع	خشک پہاڑی وادی، جدہ کے مشرق میں	زرخیز میدان، مکہ کے شمال میں
اصل معیشت	تجارت و قافلہ سالاری	زراعت، خصوصاً کھجور
پانی کا ذریعہ	زمزم و چند کنویں	کنوؤں، چشموں و وادیوں کی کثرت
دفاعی ساخت	پہاڑی درے، قدرتی گھیراؤ	حرّے و نخلستان، شمالی کھلا میدان
تاریخی کردار	دعوت و عبادت کا مرکز	اسلامی ریاست کا دارالحکومت

دونوں شہروں کی جغرافیائی تکمیل اور نتائج

دونوں شہروں کا تقابلی جائزہ بتاتا ہے کہ ان کی جغرافیائی خصوصیات ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ مکہ نے دین کو مرکزِ عبادت، تجارتی وسعت و روابط اور عالمی توجہ کا مرکز دیا، جبکہ مدینہ نے اسے زمین، خوراک، دفاعی تحفظ اور ریاستی تنظیم کے لیے عملی مقام فراہم کیا۔ اگر مدینہ بھی مکہ کی طرح بنجر ہوتا تو مہاجرین کی آبادکاری و ریاست کی معیشت دشوار ہو جاتی، اور اگر مدینہ تجارتی شاہراہ سے بالکل ہٹا ہوا ہوتا تو اس کا سیاسی اثر حجاز تک محدود رہ جاتا۔ اس کے برعکس تاریخ نے دکھایا کہ ہجرت کے بعد چند برسوں میں مدینہ پورے عرب کے قبائل سے معاہدات و وفود کا مرکز بن گیا، اور فتحِ مکہ کے بعد دونوں شہر ایک ہی ریاست کے دو روحانی و انتظامی ستون بن گئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جغرافیہ سبب ضرور ہے مگر اصل کارفرما انسانی ارادہ اور الٰہی توفیق ہے؛ جغرافیائی فوائد انہی معاشروں کے کام آتے ہیں جو انھیں دانش مندی سے استعمال کریں۔ مدنی ریاست کی قیادت نے زمین، راستوں، پانی و بازار کے بارے میں درست فیصلوں سے یہی دانش مندی ثابت کی، جیسے بازار کی تنظیم، سڑکوں و حلیف کی ترتیب اور قریبی قبائل سے روابط کا جال۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مکہ و مدینہ کی اہمیت محض واقعات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے جغرافیے کی وجہ سے بھی ہے۔ مکہ کی پہاڑی وادی نے اسے محفوظ عبادت گاہ و تجارتی منڈی بنایا، تجارتی شاہراہ نے اسے عرب و بیرونی دنیا سے جوڑا اور حرم کی حرمت نے اسے مسلسل انسانی اجتماع کا مرکز رکھا۔ مدینہ کی زرخیز زمین اور پانی نے خوراک کی بنیاد دی، حرّوں نے دفاعی حصار مہیا کیا اور شاہراہ پر ہونے نے اسے سیاسی اثر و رسوخ کا ذریعہ بنایا۔ اسی لیے پہلا شہر دعوت کا گہوارہ اور دوسرا شہر ریاست کا دارالحکومت بنا۔ جغرافیے کی اس تفہیم کے بغیر سیرت و مدنی ریاست کا مطالعہ ادھورا رہتا ہے۔

سوال نمبر 4: فلاحی ریاست کے بنیادی اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ فلاحی ریاست کے بنیادی اصول واضح کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

فلاحی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جو اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، صحت اور تحفظ، کی فراہمی کو اپنی ذمہ داری سمجھے اور خاص طور پر ان طبقات کا سہارا بنے جو خود کفیل نہیں ہیں، جیسے یتیم، بیوہ، مسکین، معذور، بوڑھے اور قرض دار۔ جدید دنیا میں فلاحی ریاست کا تصور انیسویں و بیسویں صدی کے سماجی اصلاحی رجحانات سے جڑا ہے، لیکن اسلامی تاریخ میں اس کے اصول و عمل چودہ سو سال پہلے مدینہ کی ریاست میں نظر آتے ہیں، جہاں زکاۃ کا باقاعدہ نظام، بیت المال کا ادارہ، اوقاف کی روایت اور حکمران کی ذاتی کفالت و سادگی نے فلاح کو نعرے سے بڑھا کر نظام بنا دیا تھا۔ فلاحی ریاست کے اصولوں کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ تصور اسلامی ریاست کی دیگر خصوصیات، یعنی عدل، مساوات اور امر بالمعروف، سے براہ راست جڑا ہے: جب تک کمزور طبقے کو تحفظ و سہارا نہ ملے، نہ عدل مکمل ہوتا ہے اور نہ معاشرے میں نیکی کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔ اس جواب میں پہلے فلاحی ریاست کا مفہوم و تاریخی پس منظر بیان کیا جائے گا، پھر اس کے بنیادی اصول ایک ایک کر کے واضح کیے جائیں گے، اس کے بعد مدنی دور کی عملی صورتوں اور اداروں کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں عصر حاضر کے تناظر میں ان اصولوں کی افادیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

فلاحی ریاست کا مفہوم اور قرآنی بنیاد

قرآن کریم نے دولت کی گردش کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے روکنے کا اصول بیان کیا ہے، جس کے مفہوم کے مطابق مال صرف مال دار طبقے میں گھومتا نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس کے کچھ حصے کمزور طبقات تک پہنچنے چاہئیں (سورۃ الحشر 59:7 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اسی طرح زکاۃ کے مصارف میں فقرا، مساکین، قرض داروں اور مسافروں کو باقاعدہ حق دار قرار دیا گیا ہے (سورۃ التوبہ 9:60 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان تعلیمات سے فلاحی ریاست کی بنیادی منطق نکلتی ہے: دولت انسان کی ذاتی ملکیت ہونے کے باوجود اجتماعی امانت بھی ہے، اور ریاست اس امانت کی منصفانہ تقسیم کی نگران ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اس اصول کو عمل میں ڈھالا: مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کے ذریعے فوری معاشی سہارا فراہم کیا گیا، بازار کی تنظیم سے ناجائز منافع خوری و ذخیرہ اندوزی کی حوصلہ شکنی ہوئی، اور بیت المال سے مستحقین کو وظائف ملنے لگے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ نظام وظائف کے رجسٹروں، بچوں کے دودھ کی فراہمی اور بوڑھے غیر مسلم شہری کی کفالت جیسے واقعات میں مزید منظم ہو گیا، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح مذہب کی تفریق کے بغیر انسانیت کی بنیاد پر ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اصول نمبر 1 تا 3: کفالت کی ذمہ داری، عدل و مساوات، ادارہ جاتی فلاح

فلاحی ریاست کا پہلا اصول یہ ہے کہ بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست کی اجتماعی ذمہ داری ہے، محض خیر خواہی پر چھوڑا ہوا معاملہ نہیں۔ اس کی نظری بنیاد یہ مشہور دینی تصور ہے کہ حکمران اپنی رعیت کا نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال ہو گا (متفق علیہ روایت کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ کوئی شہری بھوک، بے گھری یا علاج کی محرومی میں نہ رہے، اور ریاست کے وسائل سب سے پہلے انھی ضرورتوں پر خرچ ہوں۔ دوسرا اصول عدل و مساوات ہے: فلاحی سہولتیں بلا تفریق نسل، خاندان اور سفارش کے، صرف استحقاق کی بنیاد پر ملیں۔ مدنی عمل میں اس کی مثال یہ ہے کہ بیت المال کے وظائف میں قریبی رشتہ داری کو ترجیح نہیں دی گئی بلکہ حاجت و سبقتِ اسلامی جیسے معیار رکھے گئے۔ تیسرا اصول فلاح کا ادارہ جاتی ہونا ہے: زکاۃ و صدقات انفرادی خیرات کے بجائے باقاعدہ وصولی و تقسیم کے نظام سے چلائے جائیں تو فائدہ وسیع، منظم اور قابلِ پیمائش ہوتا ہے۔ بیت المال، محصولات کے دفاتر اور بعد میں اوقاف کے ادارے اسی اصول کی صورتیں ہیں۔ اوقاف کی روایت نے تو صدیوں تک مسجد، مدرسہ، شفاخانے، سرائے اور چشمے عوامی فلاح کے لیے وقف رکھے، اور یہ دنیا کی تاریخ میں فلاح کے سب سے پائیدار رضاکارانہ نظاموں میں شمار ہوتی ہے۔

اصول نمبر 4 تا 6: وقارِ انسانی، روزگار و خود کفالت، احتساب و شفافیت

چوتھا اصول وقارِ انسانی کی حفاظت ہے۔ فلاحی امداد اس انداز سے دی جائے کہ لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، اسی لیے اسلام نے خفیہ صدقے کو ریا والے اعلانی صدقے پر فضیلت دی اور مانگنے کو پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ فلاحی ریاست کا ہدف شہری کو ہمیشہ کا محتاج بنانا نہیں بلکہ خود کفیل بنانا ہے۔ مدنی تعلیمات میں محنت و کسب کی عزت، مانگنے کی مذمت اور خود داری کی تعریف اسی اصول کی دلیل ہے؛ معروف مفہوم کی روایات میں ہاتھ سے کمانے کو افضل باور کرایا گیا ہے۔ اس کا عملی مطلب یہ ہے کہ ریاست امداد کے ساتھ روزگار کے مواقع، ہنر کی تربیت اور چھوٹے کاروبار کے لیے مدد فراہم کرے تاکہ مدد لینے والا آئندہ مدد دینے والوں میں شامل ہو سکے۔ چھٹا

اصول احتساب و شفافیت ہے: فلاحی فنڈز عوام کی امانت ہیں، ان کا غلط استعمال بد دیانتی اور خیانت ہے۔ مدنی و راشدی دور میں عاملینِ زکاۃ کا حساب، بیت المال کی جانچ اور حکمرانوں کی ذاتی سادگی اسی احتساب کی عملی شکل تھی۔ اگر شفافیت نہ ہو تو فلاحی نظام بدنامی، سفارش اور بدعنوانی کا شکار ہو کر اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے، اس لیے ہر فلاحی اسکیم کے ساتھ نگرانی اور رپورٹ کا نظام لازمی جزو ہے۔

جدول: فلاحی ریاست کے بنیادی اصول اور ان کی مدنی عملی صورتیں

اصول	مفہوم	مدنی / راشدی عملی صورت
کفالت کی ریاستی ذمہ داری	بنیادی ضروریات ریاست پورا کرے	بیت المال سے وظائف و خوراک
عدل و مساوات	امداد صرف استحقاق پر	بلا تفریق نسل و خاندان تقسیم
ادارہ جاتی فلاح	منظم وصولی و تقسیم	زکاۃ کا نظام، اوقاف کی روایت
وقارِ انسانی	امداد عزتِ نفس کے ساتھ	خفیہ صدقہ و خودداری کی تعلیم
خود کفالت کی تربیت	محتاج کو کمائی کے قابل بنانا	مواخات، کسب و ہنر کی ترغیب
احتساب و شفافیت	فنڈز امانت، حساب لازمی	عاملین کا حساب، حکمران کی سادگی

فلاحی ریاست کے ثمرات اور عصری افادیت

ان اصولوں پر قائم فلاحی ریاست کے ثمرات سماجی بھی ہیں اور معاشی و اخلاقی بھی۔ سماجی سطح پر غربت و محرومی سے پیدا ہونے والے جرائم کم ہوتے ہیں، طبقاتی کشمکش گھٹتی ہے اور عوام کا ریاست پر اعتماد بڑھتا ہے۔ معاشی سطح پر کمزور طبقات کی قوتِ خرید برقرار رہنے سے بازار میں گردشِ دولت جاری رہتی ہے اور معیشت چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے وسیع بنیادوں پر پھیلتی ہے۔ اخلاقی سطح پر امیروں میں سخاوت و ذمہ داری اور غریبوں میں عزتِ نفس و شکر گزاری کا مزاج پروان چڑھتا ہے، اور پورا معاشرہ بھائی چارے

کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ عصرِ حاضر میں ان اصولوں کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے، کیونکہ مہنگائی، بے روزگاری اور صحت و تعلیم کے اخراجات نے عام آدمی کی زندگی مشکل بنا دی ہے۔ مسلمان ریاستوں کے لیے مدنی فلاحی اصول ایک تیار شدہ اخلاقی و انتظامی خاکہ فراہم کرتے ہیں: زکاۃ و اوقاف کو جدید مالی نظم سے جوڑ کر سماجی تحفظ کا مضبوط جال بچھایا جا سکتا ہے، بشرطے فنڈز میں شفافیت اور تقسیم میں عدل قائم رہے۔ البتہ کسی خاص شرعی مسئلے میں مثلاً زکاۃ کے نصاب و مصارف کی جزئیات میں قطعی فیصلہ مستند علماء کا کام ہے؛ یہ جواب صرف اصول و نظام کی علمی وضاحت تک محدود ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فلاحی ریاست کے بنیادی اصول چھ ہیں: ریاست کی اجتماعی کفالت کی ذمہ داری، عدل و مساوات پر مبنی تقسیم، فلاح کا ادارہ جاتی و منظم نظام، انسانی وقار کی حفاظت، شہری کو خود کفیل بنانے کا ہدف، اور ہر سطح پر احتساب و شفافیت۔ یہ اصول مدنی ریاست میں زکاۃ، بیت المال، معاہدات اور اوقاف کی صورت میں عملاً موجود تھے اور بعد کے اسلامی ادوار میں ان کی توسیع ہوتی رہی۔ جو ریاست ان اصولوں کو اپنا لے وہ محض ٹیکس وصول کرنے والی مشین نہیں رہتی بلکہ اپنے کمزور شہریوں کی ماں کی طرح نگہبان بن جاتی ہے، اور یہی وہ فلاحی تصور ہے جو مدنی ریاست کو آج بھی جدید نظاموں کے سامنے ایک قابلِ تقلید نمونے کی حیثیت دیتا ہے۔

سوال نمبر 5: میثاقِ مدینہ کے سیاسی فوائد و ثمرات (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ میثاقِ مدینہ کے سیاسی فوائد و ثمرات تحریر کریں۔ (20)

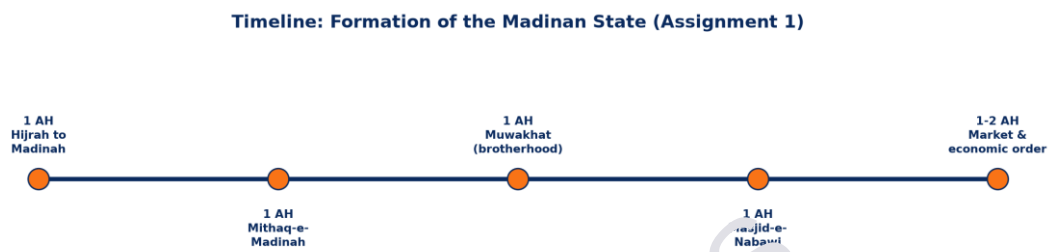
تمہید و تعارف

ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اقدامات کیے ان میں میثاقِ مدینہ تاریخ ساز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تحریری دستاویز تھی جس میں مہاجرین، انصار کے قبائل اوس و خزرج اور مدینہ کے یہودی قبائل سمیت شہر کی تمام بڑی جماعتوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیے گئے۔ اس زمانے میں مدینہ کی حالت نازک تھی: اوس و خزرج

کے درمیان طویل خانہ جنگیوں کی تلخیاں باقی تھیں، یہودی قبائل معاشی و عسکری طور پر مضبوط تھے، مہاجرین بے گھر و بے سروسامان تھے اور قریشِ مکہ کی دشمنی کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ ایسی فضا میں میثاق نے بکھرے ہوئے قبائل کو ایک سیاسی وحدت میں باندھا، اسی لیے بہت سے محققین اسے دنیا کی اولین تحریری آئینی دستاویزات میں شمار کرتے ہیں۔ میثاق کے سیاسی فوائد و ثمرات اسی پس منظر میں سمجھے جا سکتے ہیں، کیونکہ اس نے داخلی اتحاد، خارجی دفاع، قانونی نظام اور اقلیتوں کے تحفظ جیسے بنیادی مسائل کو ایک ہی دستاویز سے حل کر دیا تھا۔ اس جواب میں پہلے میثاق کی نوعیت و بنیادی شرائط کا خلاصہ پیش کیا جائے گا، پھر اس کے سیاسی فوائد کو داخلی و خارجی پہلوؤں میں تقسیم کر کے بیان کیا جائے گا، اس کے بعد اس کے دور رس ثمرات اور عصرِ حاضر کے لیے اس کے اسباق پر روشنی ڈالی جائے گی۔ دستاویز کی باتیں عام سیرت ماخذ میں موجود معروف نکات کے مفہوم کی صورت میں بیان کی جا رہی ہیں، الفاظ کی ہو بہو نقل پیش نہیں کی گئی۔

میثاقِ مدینہ کی نوعیت اور بنیادی نکات

میثاقِ مدینہ کی نوعیت قبائلی معاہدے سے آگے بڑھ کر ایک شہری و ریاستی دستاویز کی ہے، کیونکہ اس میں نسلی وحدت کے بجائے رہائش و سیاسی وحدت کو بنیاد بنایا گیا۔ اس کے معروف بنیادی نکات کے مطابق تمام مسلمان ایک امت قرار پائے، مدینہ کے یہودی اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے شہر کے سیاسی نظام کا حصہ تسلیم کیے گئے، ہر جماعت اپنے اندرونی معاملات میں اپنے رواج و دین کے مطابق فیصلے کرنے میں آزاد رکھی گئی، اجتماعی دفاع سب کی مشترکہ ذمہ داری قرار پایا، حرمِ مدینہ میں خونریزی ممنوع کی گئی، اور تمام تنازعات کا آخری مرجع اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کو قرار دیا گیا (سیرت نگاروں کے بیان کردہ نکات کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان نکات میں تین چیزیں خاص اہم ہیں: پہلی یہ کہ شہریت کی بنیاد قبیلہ نہیں ریاست ہوئی، دوسری یہ کہ مذہبی آزادی دستاویز کی سطح پر تسلیم ہوئی، اور تیسری یہ کہ مرکزیت فیصلہ سازی کے لیے ایک بالاتر مرجع قائم ہو گیا۔ انہی تین بنیادوں پر میثاق کے تمام سیاسی فوائد کھڑے ہیں، جن کا تفصیلی جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔



شکل: مدنی ریاست کی تشکیل میں میثاقِ مدینہ کا مقام—ہجرت کے ابتدائی اقدامات کی زمانی ترتیب۔

داخلی سیاسی فوائد: اتحاد، امن اور قانون

میثاق کا پہلا داخلی فائدہ قبائلی خانہ جنگی کا خاتمہ تھا۔ اوس و خزرج کے درمیان جنگِ بعاث سمیت سو سال سے زیادہ کی دشمنی نسل در نسل چلی آ رہی تھی؛ میثاق نے دونوں کو ایک امت و ایک شہر کے شہری بنا کر اس دشمنی کی جڑ کاٹ دی اور مہاجرین کو بھی اسی بندھن میں شامل کر دیا۔ دوسرا فائدہ قانون کی بالادستی کا قیام تھا: قبائلی انتقام یعنی قتل کے بدلے غیر محدود خونریزی کے بجائے دیت و قصاص کے منظم قواعد طے ہوئے، ہر قبیلہ اپنے مجرم کا خود ذمہ دار ہوا اور ظلم کرنے والے کے خلاف سب کے تعاون کا اصول مقرر ہوا، خواہ مجرم کسی بڑے گھرانے سے ہو۔ تیسرا فائدہ مرکزی قیادت کو آئینی سند ملنا تھا؛ اختلاف کی صورت میں رجوع کا مرجع متعین ہو جانے سے فیصلے شخصی خواہش کے بجائے دستاویز کے تحت ہونے لگے، اور یہ جدید آئینیت کی بعینہٖ وہی روح ہے جو ریاست کو شخصی حکمرانی سے نکال کر قانونی حکمرانی میں بدلتی ہے۔ چوتھا فائدہ شہری امن و تجارت کا استحکام تھا: حرم میں لڑائی کی ممانعت اور بازار کی آزادی سے مدینہ کی معیشت مستحکم ہوئی، یہودی تاجروں و کاشتکاروں کو بھی تحفظ ملا، اور شہر میں آنے جانے والے قافلوں کے لیے فضا ساز گار ہو گئی۔ اس طرح میثاق نے وہ اندرونی سلامتی پیدا کر دی جس کے بغیر کوئی ریاست خارجی خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

خارجی سیاسی فوائد: دفاع اور سفارتی حیثیت

خارجی اعتبار سے میثاق کا سب سے بڑا فائدہ اجتماعی دفاع کا نظام تھا۔ دستاویز کے مطابق شہر پر حملے کی صورت میں تمام گروہ مل کر دفاع کریں گے اور کوئی گروہ دشمن سے الگ سے صلح یا رابطہ نہیں رکھے گا۔ اس شق نے قریشِ مکہ اور ان کے حلیف قبائل کے لیے مدینہ کو ایک منقسم آبادی کے بجائے متحد قلعے کی حیثیت دے دی اور شہر کے اندر سے دشمن کو

مدد ملنے کے امکانات ختم کر دیے۔ یہی اتحاد تھا جس نے بدر، احد اور خندق جیسے سخت مواقع پر مدینہ کو قائم رکھا؛ خندق کے موقع پر پورے شہر کی مشترکہ دفاعی تیاری میثاق ہی کی عملی توسیع تھی۔ دوسرا خارجی فائدہ مدینہ کی سفارتی حیثیت کا قیام تھا: اب گردوپیش کے قبائل کے لیے واضح ہو گیا کہ مدینہ ایک منظم ریاست ہے جس سے معاہدے کیے جا سکتے ہیں، اور انہی بنیادوں پر بعد میں قبائل سے سلامتی امدادات قائم ہوا جنھوں نے ریاست کا اثر پورے حجاز میں پھیلایا۔ تیسرا فائدہ نفسیاتی و اعتباری تھا: جنگجو قبائل کے درمیان ایک تحریری دستاویز کی پاسداری نے اہلِ مدینہ کی ساکھ قائم کی کہ یہ ریاست وعدے کی پابند ہے، اور وعدے کی پابندی ہی سفارت کاری کی اصل سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ البتہ جہاں کسی گروہ نے بدعہدی کی، وہاں کارروائی بھی دستاویز کی خلاف ورزی کی بنیاد پر، یعنی ریاستی عمل کے ذریعے ہوئی، جو میثاق کی ایک اور خوبی ہے کہ اس نے سزا کو بھی انتقام کے بجائے قانون سے جوڑ دیا۔

سیاسی ثمرات: ریاست کی بنیاد سے وسعت تک

میثاق کے دوررس ثمرات پر نظر ڈالیں تو پہلا ثمرہ یہ نکلا کہ مدینہ ایک شہری ریاست کی مستقل بنیاد بن گیا۔ آبادی، جغرافیہ، قیادت، قانون، ریاست کے یہ چاروں عناصر میثاق کے ذریعے یکجا ہو گئے اور پھر اسی مرکز سے جزیرہ نما عرب کی سیاست کا رخ بدل گیا۔ دوسرا ثمرہ امت و شہریت کے نئے تصور کی ترویج ہے: مسلمانوں کی وحدت عقیدے پر اور شہر کے غیر مسلم باشندوں کی شمولیت شہری معاہدے پر قائم ہوئی، اور یہ دوہرا مگر مربوط نظام آج کے کثیر المذاہب معاشروں کے لیے بھی غور و فکر کا اہم نمونہ ہے۔ تیسرا ثمرہ اداروں کی پیدائش ہے، کیونکہ متعین حقوق و فرائض نے عدالت، بازار کی نگرانی، فوجی تنظیم اور مالیات جیسے اداروں کو دستوری بنیاد فراہم کی۔ چوتھا ثمرہ سیاسی تربیت ہے: صحابہ کرام نے میثاق کے ذریعے سیکھا کہ اختلاف کو معاہدے و قانون سے حل کیا جاتا ہے نہ کہ تلوار سے، اور یہی تربیت بعد میں خلافت کی وسعتوں میں کام آئی، جہاں مختلف اقوام و مذاہب کے لوگ ایک قانون کے تحت زندگی گزارنے لگے۔ پانچواں ثمرہ تاریخی ہے: میثاق تحریری آئین کی روایت کا نقطۂ آغاز بن گیا، اور بہت سے جدید محققین، مسلم و غیر مسلم، نے اسے اسی حیثیت سے تسلیم کیا ہے کہ تحریر شدہ حقوق و فرائض کی یہ ابتدائی دستاویز انسانی سیاسی ارتقا میں خاص مقام رکھتی ہے۔

جدول: میثاقِ مدینہ کے اہم سیاسی فوائد کا خلاصہ

نتیجہ	فائدہ	شعبہ
ایک امت و ایک شہری نظام	اوس و خزرج کی دشمنی کا خاتمہ	داخلی اتحاد
قانون کی بالادستی	دیت و قصاص کے قواعد، انتقام کا خاتمہ	قانون
بدر تا خندق مدینہ کا استحکام	اجتماعی دفاع کی شق	دفاع
پرامن بقائے باہمی کا نمونہ	یہود کے قبائل کے مذہبی و شہری حقوق	اقلیتیں
آئینی مرکزیت	تنازع میں رجوع کا تعین مرجع	قیادت

عصر حاضر کے لیے اسباق

میثاقِ مدینہ کے سیاسی اسباق آج کے لیے بھی نمایاں ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ تحریری آئین اور واضح حقوق و فرائض معاشرے کو اندرونی کشمکش سے بچاتے ہیں؛ جہاں اصول لکھے ہوئے ہوں وہاں طاقت کی دلیل کے بجائے دستاویز کی دلیل چلتی ہے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اقلیتوں کو ریاست کے نظام میں شریک رکھنا اور ان کے مذہبی و شہری حقوق کی دستوری ضمانت دینا سیاسی استحکام کی بنیاد ہے، اس لیے کہ خارج کیا ہوا طبقہ ہی بیرونی مداخلت اور اندرونی انتشار کا ذریعہ بنتا ہے۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ دفاع و خارجہ پالیسی میں وحدتِ فیصلہ ریاست کی جان ہے اور الگ سے دشمن سے معاملات قومی سلامتی کے خلاف ہیں۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ معاہدے کی پاسداری ریاست کی ساکھ ہے؛ اسلامی سیاست میں بدعہدی کو سخت ناپسند کیا گیا ہے اور میثاق کی پوری قدر و قیمت اسی پاسداری پر قائم تھی۔ پانچواں سبق یہ ہے کہ اصلاحات کا آغاز مرکزی شہر اور اپنے نظام سے کرنا چاہیے: مدینہ اندر سے مضبوط ہوا تو باہر کے مسائل خود بخود آسان ہونے لگے۔ ان اسباق کو آج کی ریاستوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو آئین پسندی، شہری مساوات، اقلیتی تحفظ اور معاہداتی پابندی وہی جدید اصول نظر آتے ہیں جن کی ابتدائی و جامع صورت میثاقِ مدینہ میں موجود تھی۔ البتہ شرعی احکام کے کسی خاص واقعی اطلاق کا فیصلہ علماء و عدالتوں کا اختیار ہے؛ یہاں صرف سیاسی و تاریخی اصولوں کی علمی وضاحت مقصود ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ میثاقِ مدینہ محض ایک معاہدہ نہیں بلکہ پہلی اسلامی ریاست کا آئین و بنیاد تھی۔ اس کے سیاسی فوائد میں قبائلی دشمنیوں کا خاتمہ، قانون کی بالادستی، آئینی مرکزیت، شہری امن، اجتماعی دفاع اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ شامل ہے، اور اس کے ثمرات میں ریاست کا استحکام، امت و شہریت کے تصورات کی ترویج، اداروں کی تشکیل اور بالآخر پورے جزیرہ نما عرب کی سیاسی تبدیلی نمایاں ہے۔ اس دستاویز نے ثابت کیا کہ طاقت کے بجائے اصول و معاہدے سے قائم ہونے والی ریاست زیادہ دیرپا اور زیادہ منصفانہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کے مطالعے میں میثاقِ مدینہ کو ریاستِ مدینہ کا سنگِ بنیاد اور سیاسی حکمت کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com